بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

معاشرے کو اسلام کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اوّل درجے کی اہمیت نظامِ تعلیم کی تبدیلی کو حاصل ہے۔

مگر ہر دوسرے دائرے کی تبدیلی کی طرح نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے بھی کچھ خاص مسائل ہیں جو خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

پہلا مسئلہ بڑا اصولی قسم کا ہے وہ یہ کہ ایک صورت جزوی ترمیمات اور تبدیلیوں کی ہوتی ہے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی بڑے اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری صورت پورے نظام کو نئی بنیادوں پر از سرِ نو استوار کرنے کی ہے۔ یہ ایک بھاری اور وسیع کام ہے اور اسے انجام دینے کے لیے بہت سی ضروریات ہیں جن کو اگر صحیح طور سے پورا نہ کیا جائے تو منزلِ مراد نہیں ملتی۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارے سامنے تبدیلی کا پروگرام تو بنیادی اور جامع قسم کا ہے، مگر مردانِ کار زیادہ تر ایسے ہیں جو جزوی ردّوبدل کے لیے موزوں ہیں۔

ایسے احوال میں جو کام ہوتا ہے اس میں طرح طرح کی اُلجھنیں موجود رہتی ہیں اور معاشرے میں وہ اطمینان پیدا نہیں ہوتا جس کے لیے سارا کام کیا جاتا ہے۔

اب تک تعلیم کے دائرے میں جو کچھ ہوا ہے اُس کی قوتِ محرکہ ہمارے ان مفکرین کی کاوشیں ہیں جنھوں نے اسلامی نظامِ تعلیم کی اُمنگ پیدا کی ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں کو انھوں نے دلائل سے

قائل کیا ہے اور عام لوگوں میں ایک جذباتی طلب نمودار ہوتی ہے۔ مفکرین کے کام کو اہل صحافت ارباب سیاست، اور اصحاب خطابت نے آگے بڑھایا اور تعلیمی تبدیلی کے مطالبے کو عوامی دائرے تک پہنچایا۔ فطری بات تھی کہ جوں جوں نظام اسلامی کے لیے تحریک بڑھتی جائے، ساتھ کے ساتھ نظام تعلیم کی تبدیلی کی خواہش بھی زور پکڑے۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء میں اٹھنے والی قومی اتحاد کی طوفانی تحریک کے اُبھار کے بعد تعلیمی انقلاب کا جذبہ عام ہوگیا۔ آج سیاسی جماعتیں، مذہبی گروہ، اساتذہ کے حلقے اور طلبہ کی تنظیمیں اور اخبارات وجرائد کا بیشتر حصہ اسلامی نظامِ تعلیم کو جلوہ گر دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔

یہ دباؤ خاصی حد تک پہلے بھی موجود تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دورِ ایوبی میں ایک نئی تعلیمی پالیسی بنی، مگر وہ عملاً بے اثر ثابت ہوئی۔ پھر ایک نئی پالیسی بھٹو صاحب کے دور میں نمودار ہوئی اور اس کے مطابق نصابیات کی تدوین بھی ہوئی، مگر وہ نہایت ناقص اور ناقابل اطمینان تھی۔ اب پھر ایک پالیسی بن کر سامنے آئی ہے جس میں اگرچہ بعض پہلو بہت خوش آئند ہیں۔ اور پہلے کے مقابلے میں اسلام کے حق ایسی صراحتیں اس میں آگئی ہیں جن کی مثال پہلے کی پالیسیوں میں نہیں ملتی۔ سابق پالیسیوں میں اسلام کی بات کرتے ہوئے، اسلام سے گریز کی ذہنیت کارفرما تھی اور صرف پالیسی کی سطح کو خوشنما بنانے کے لیے اسلامی رنگ کی وارنش استعمال کی جاتی تھی۔ اب کے اسلام سے گریز کی وہ صورت نہیں ہے۔

مثلاً تعلیم کے مقاصد یا غایات کے متعلق جو اوّلین کلمات کہے گئے ہیں وہ خاصے قابلِ تحسین ہیں۔ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ ہمارے تعلیمی مقاصد کو ہمارے ایمان وعقیدے (یعنی دین) کے مطابق ہونا چاہیے۔ نیز قومی نظریات اور امنگوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس اصول کے تحت نقشۂ کار بہت ممیز اور بدیہی ہونا چاہیے۔ اور اُسے جرأت مندی اور نیتوں کی صفائی کے ساتھ تشکیل دیا جانا چاہیے تاکہ ملک کی تعلیمی مساعی کو ایک مضبوط اور جاندار بنیاد فراہم ہوسکے۔ ملک کے باشندوں، خصوصاً طلبہ کے قلوب واذہان میں اسلام کے لیے ایک گہری اور پائیدار وفاداری پیدا کی جاسکے، اور مسلم قومیت کا ایک زندہ شعور ان میں کارفرما ہو۔ ہر طالب علم میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اُمتِ مسلمہ کا ایک حصہ ہے۔ جس کے طرزِ فکر میں وحدت

پیدا کرنے کے لیے اُسے اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری دُنیا میں دعوتِ اسلامی کو پھیلانے کا ذریعہ بنے۔ میں قرآن وسنت کے تقاضوں کے مطابق اخلاق وکردار کو نشوونما دی جائے اور قول وعمل کے درمیان فاصلوں اور خلیجوں کو پاٹ کر ان میں ایسا ولولۂ عمل پیدا کیا جائے جس کی توقع سچے مسلمان سے کی جاتی ہے۔ ان میں ایسی قابلیت وصلاحیت پیدا کی جائے کہ سماجی، قدرتی اور پیدا آور قوتوں کا مؤثر انضباط اسلام کے نظامِ اقدار کے مطابق کر سکیں۔

تعلیمی مقاصد کا یہ ملخص میں نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ یہ پچھلی تمام کوششوں سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اور اس کا کریڈٹ اوّلاً چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کو، اور بعد ازاں قومی اتحاد کے لیڈروں اور کارکنوں، نیز اسلامی کونسل اور اسلام آباد تعلیمی کانفرنس سب کو جاتا ہے۔

مقاصد کے بیان میں اگر کوئی کمی ہے تو یہ ہے کہ اس میں ویسا انقلابی داعیہ کارفرما نہیں جس کا تقاضا اسلام کی صحیح تعبیر کرتی ہے اور جس کی مثال دورِ حاضر میں ایک مخالفِ اسلام تحریک یعنی اشتراکیت میں پائی جاتی ہے۔

اشتراکی پالیسیاں خواہ مزدوروں اور کسانوں سے متعلق ہوں، سائنس دانوں اور مصنفوں سے متعلق ہوں، سپاہیوں اور انجینیروں سے متعلق ہوں، یا تعلیم اور نشریات سے متعلق ہوں، ہر شعبے میں کام کرنے والوں کو یہ شعور دلایا جائے گا کہ تم ایک انقلاب کے علمبردار سپاہی ہو اور تمہیں ساری دُنیا میں یہ انقلاب برپا کرنا ہے۔

ہمارے ملک تعلیمی پالیسی کو تشکیل دینے والے فاضل حضرات میں اگرچہ طرح طرح کی علمی وتحقیقی قابلیتیں اور ٹکنیکل مہارتیں جمع ہیں، مگر ان کے ذہنوں میں انقلابیت موجود نہیں ہے۔ تجدید واحیائے اسلام کا کام تعلیم کے حلقے سے لے کر پوری زندگی کے وسیع دائرے تک سرانجام دینے کے لیے ایمانی انقلابیت کی ضرورت ہے۔ یہ انقلابیت اگر موجود ہوتی تو تعلیمی پالیسی میں ہم اس کی جھلک ضرور دیکھتے۔ موجودہ تعلیمی پالیسی میں جہاں دنیا بھر میں اسلام کا پیغام پھیلانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بات بہ انداز دگر ہوتی اور طالب علم سے کہا جاتا کہ تم اسلامی انقلاب کے علمبردار اور خدا کے سپاہی ہو، تمہیں ساری دنیا کو اس پر

تیار کرنا ہے کہ تمام قومیں اپنے اپنے یہاں اسلامی انقلاب برپا کریں۔

یہ نقطۂ نظر نہ صرف نئے نظام تعلیم کو مؤثر بنا دیتا، بلکہ نوجوان طلبہ کے دلوں کو ایسی حرکت و حرارت سے مالا مال کر دیتا کہ وہ اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں بھی لگن دکھاتے اور ساری انسانیت کو اسلام کے پاکیزہ، فلاحی اور تعمیری انقلاب کا راستہ دکھانے کی بھاری ذمہ داری کے لیے تیاری بھی کرتے۔

غالباً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لفظ انقلاب کے معنی مار دھاڑ خون خرابے کے ہیں۔ حالانکہ اس اصطلاح کو یہ مفہوم تو اشتراکیوں کے عملی تجربوں نے دیا ہے۔ اصلاً انقلاب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جزوی تبدیلیوں کے بجائے جامع تبدیلی مطلوب ہو، دوسرے یہ کہ اس کے لیے بھرپور رفتار سے جدوجہد کی جائے اور تیسرے یہ کہ مزاحم قوتوں اور مخالف رجحانات سے سمجھوتے کرنے کے بجائے ان کا مقابلہ کیا جائے، نیز کرنے کے کام ادھورے یا ادھ کچرے طریق سے نہ کیے جائیں۔ بلکہ اصول و معیار کے مطابق کیے جائیں۔

دوسرا مفہوم انقلابی نقطۂ نظر کا یہ ہوتا ہے کہ جب کام کر رہا ہو تو آدمی کی سوچ بچار یوں ہوتی ہے کہ مجھے فلاں کام فلاں طریق سے ضرور کرنا ہے اور وہ اگر کچھ کرنے کا موقع پاتے تو پھر کسر نہیں چھوڑتا۔ وہ حالات کو مجبور کرتا ہے کہ سازگار ہوں، رکاوٹیں دور ہوں۔ مزاحمت کرنے والے لوگوں کو خوش اسلوبی سے، یا قوت سے درست کر لیتا ہے۔ ذہن انقلابی نہ ہو تو آدمی مصلحتوں اور اندیشوں میں گھرا رہتا ہے اور ہر مزاحم قوت کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا ہے۔

ہماری تازہ ترین تعلیمی پالیسی کے پیچھے انقلابی ذہن کا کارفرما نہ ہونا اُسے کمزور کر دیتا ہے۔

پچھلی گفتگو کی روشنی میں اسی تعلیمی پالیسی کے ایک خصوصی باب کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اگرچہ ایک زوردار پیراگراف سائنسی تعلیم کے متعلق لکھا گیا ہے، مگر واضح تعلیمی مقاصد کے رُو سے نقطۂ نظر کی جو تبدیلیاں سائنس کی تدریس و تعلیم میں آنی چاہییں ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ مقاصد کو مختلف ابواب میں ہم دخیل نہیں دیکھتے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ابواب کے نوٹس الگ الگ لکھے گئے ہیں۔ اور ان پر مقاصد والا نوٹ چسپاں کر دیا گیا ہے۔

مثلاً سائنس کی تدریس اور نصابی تدوین میں جس زاویۂ نگاہ (APPROACH) سے اسلامی نظامِ تعلیم میں کام لینا ہے اور وہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام کاوشوں، تجربوں اور انکشافات و اکتشافات کا مدعا کائنات وحیات میں کارفرما قوانینِ الٰہی یا سنت اللہ کو معلوم کرنا ہے۔ اشیاء اور قوتوں کے متعلق سننِ الٰہیہ کا علم جتنا جتنا بڑھے گا، اتنا ہی ہم خدا کے پیدا کردہ مادی وسائل یا متاعِ دنیوی سے زیادہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس ایمانی تصور کے تحت اب بات اس طرح پیش نہ کی جائے گی کہ یہ نیوٹن کا قانون ہے اور وہ جان ڈیوی کا یا آئن سٹائن کا، بلکہ اب نیا پیرایۂ بیان یہ ہوگا کہ جان ڈیوی یا نیوٹن نے فلاں فلاں قانونِ الٰہی کو دریافت کیا۔ اسی طرح یہ کہا جائے گا کہ فلاں عالم نے فلاں دائرے میں قانونِ الٰہی کا جو تصور اخذ کیا تھا، اُسے بعد کے کسی محقق نے غلط ثابت کر دیا ہے اور اب سنت اللہ کے متعلق ہماری معلومات یہاں تک پہنچی ہیں۔ وغیرہ

ہر چیز متاع ہے، ہر چیز خدا کی امانت ہے۔ ہر چیز خدا کے قوانین کے تحت کام کرتی ہے، اور ہر چیز سے استفادہ کرنے کے لیے خدا کی سنت کو معلوم کرنا ضروری ہے۔ اور ہر چیز سے ان حدود میں کام لیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں۔

پھر سائنس کی تدریس میں ہمیں اپنے طالب علم کو اس احساسِ کہتری سے نکالنا ہے کہ سائنس بس اہلِ مغرب کا عطیہ ہے۔ ہمیں اس کا سرا ایک طرف تاریخِ بعید میں تلاش کر کے دکھانا ہے کہ انسانیت شروع سے سائنس کے علم اور اس کے دائرہ استعمال میں اضافہ کرتی آئی ہے۔ دوسری طرف ہمیں اپنے طالب علم کے سامنے یہ حقیقت بھی رکھنی ہے کہ ہمارے اسلاف نے سائنس کا بہت سا سفر طے کیا۔ انھوں نے ایجادات کیں، علوم کی بنیاد رکھی۔ لیکن بعد میں جب ان کے اندر اسلام کی انقلابی تحریک کے دیے ہوئے جذبے میں کمی آگئی تو ان کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی تفوق ختم ہوا اور اس کے ساتھ سائنس کی راہ پر بھی ان کی پیش قدمی رُک گئی۔ بعد ازاں ان کی یونیورسٹیوں سے پڑھ کے جانے والے اُن کے شاگردوں نے مذہبی، سیاسی، معاشی و سماجی دائرے میں بھی اور سائنس اور تعلیم کے دائرے میں بھی سرگرمی سے کام شروع کیا۔ دراصل مغرب نے مختلف علوم اور سائنس کی جو عمارت بلندیوں تک پہنچا دی ہے اس کی بنیادیں مسلمانوں نے رکھی تھیں اور اسی بنا پر ہم دورِ جدید کی سائنسی ترقیات میں حصہ دار ہیں۔ ساتھ ہی طلبہ میں یہ جذبہ پیدا کیا جائے

کہ اب انہیں اپنے اسلاف کی عظمت کا احیا کرنا ہے اور دوسرے دائروں کے ساتھ ساتھ سائنس کے سفر کو از سرِ نو جاری کرنا ہے۔ یہ مہم نہ صرف اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے ضروری ہے، بلکہ بین الاقوامی وقار کے لیے لازم ہے۔

اسی طرح خواتین کی تعلیم کے باب میں کوئی اشارہ نہیں اُن کے اس اختصاصی مقام کے متعلق جو خدا و رسولؐ نے واضح اور قطعی انداز میں متعین کیا ہے۔ بخلاف اس کے مغربی تہذیب نے اپنے سیکولر اصولوں اور انسان کے حیوانی تصوّر کے تحت اُن کے لیے جو طرز و اسلوب رائج کیا ہے، اُس سے آگے سوچنے کی جرأت مسلم معاشروں میں نہیں ہے۔ آج بھی یہ خطرا باقی ہے کہ کہیں کسی جداگانہ طرزِ فکر کی وجہ سے ہمیں قدامت پسند اور پسماندہ نہ قرار دے دیا جائے۔ اِس خود مسلط کردہ غیر اختیاری دباؤ کے زیر اثر ہم یہ بات فخر اور احساس برتری کے ساتھ کہنے کی تاب نہیں رکھتے کہ عورت کو ترقی کے نام پر جس پستی میں مغرب نے لا ڈالا ہے، ہم اپنی خواتین کے لیے اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر واقعی مطلوب اسلام ہے تو پردہ (خواہ اس کا کم سے کم درجے کا فقہی تصوّر سامنے رکھا جائے) کا قانون لازم ہے۔ گھروں کے باہر صنفین کا بے محابہ قسم کا اختلاط (FREE MIXING) درست نہیں ہے۔ گھر کے ادارے کا تحفظ اور بنیادی انسانی رشتوں اور روابطوں کا استحکام مطلوب ہے۔ نئی نسل کو پوری مادری توجہ کی فراہمی ضروری ہے۔ نسائیت کے وقار و احترام کی کڑی حفاظت موجودہ دَور کی کاروباریت اور دولت پرستی اور جنسی ہیجانات کے مقابلے میں شدید طور پر اہم ہے۔ خواتین کی تعلیم کا مسئلہ اسلام کے ان بنیادی تصورات کے فریم میں رکھ کر زیرِ غور لانا چاہیے۔

اس کے لئے نظامِ تعلیم میں لازمی طور پر خواتین کے لئے جداگانہ تعلیمی اداروں کا انتظام ہونا چاہیے اور مخلوط تعلیم کو یکسر ختم کر دینا چاہیے۔ پہلے جو تعلیمی مدارج (TIERS) تھے ان کے لحاظ سے معاشرے کا یہ مطالبہ تھا کہ یونیورسٹیوں کی سطح پر خواتین کے لئے تعلیمی انتظام جداگانہ ہو۔ چنانچہ خواتین یونیورسٹی کا آوازہ نیچے ہی سے نہیں اوپر سے بھی سنائی دیا۔ اور ملک میں اس کی گونج بڑی مسرت سے محسوس کی گئی۔ اب تعلیمی مدارج (TIERS) کی نئی تقسیم کی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ نویں جماعت

سے جو آئندہ انٹرمیڈیٹ کالجوں کا حصہ ہوگی، خواتین کی تعلیم کے لئے الگ غیر مخلوط ادارے قائم کئے جائیں بدقسمتی سے آہستہ آہستہ خواتین یونیورسٹی کا آوازہ عملی اقدام نہ ہونے کی وجہ سے دبتا چلا گیا اور نئی پالیسی نے تو گویا اسے بالکل مدفون کر دیا ہے۔ خصوصاً نئے مدارج تعلیم کی تقسیم خاصی پیچیدہ صورتحالات پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ جس تعلیمی پالیسی کے بنیادی مقاصد میں واضح طور پر ایک مقصد یہ بھی رکھا گیا تھا کہ طلبہ کی زندگیوں میں قول و عمل کے فاصلوں کو ختم کرنا ہے۔ وہ پالیسی خود اسلامیت کے دعوے سے تضاد رکھتی ہے۔

اگر تعلیمی دانشوروں میں خدا اور رسول کے لئے حقیقی ایمان موجود ہے تو انہیں یا تو جرأت سے مغربیت اور سیکولرازم کے بنائے ہوئے طلسمِ ترقی کو توڑ کر خواتین کی تعلیم کا جداگانہ انتظام کرنے کا اعلان کرنا چاہئے، اور یا اس پالیسی میں یہ لکھ دینا چاہئے کہ اسلام کے جو تقاضے خواتین کی تعلیم کے متعلق ہیں وہ ہم پورے نہیں کر سکتے۔

بہرحال نئی تعلیمی پالیسی کے پیچھے حقیقی انقلابی ذہن کارفرما نہیں ہے۔

انقلابی ذہن وہ ہوتا ہے جو کسی بھی تبدیلی کے لئے برسوں سوچ بچار کرتا ہے۔ غلط حالات پر مضطرب ہوتا ہے، صحیح نقشے کے کارفرما ہونے کے لئے دعوت دیتا ہے، متعلقہ سوالات اور الجھنوں کو حل کرتا ہے، اس کے اندر دانش وری کے ساتھ ساتھ ایک ایمانی شعور اور انقلابی جذبہ موجود ہوتا ہے۔

یہاں چونکہ اسلامی جذبہ، انقلاب کے ساتھ مسئلہ تعلیم پر سوچنے والے ذہن پس منظر میں ہیں، اور جن لوگوں کو تعلیمی سندات اور عہدوں کی وجہ سے نیا نقشہ تعلیم بنانے پر لگا یا گیا تھا، وہ نہ تو انقلابی دردمندی رکھتے ہیں، نہ ویسی حرکت و حرارت۔ وہ محض ٹکنیکل ماہرین ہیں۔ وہ ایک کمپیوٹر کی طرح کام کر سکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ فلاں تبدیلی مطلوب ہے، انہوں نے انجینئرز کی طرح اس کا خاکہ مرتب کر دیا یہ خاکہ بڑا وقیع ہے۔ ان کی پالیسی بڑی شاندار ہے۔ مگر سارے نظامِ تفکر کی رگوں میں گردش کرنے والا وہ خون نہیں ہے جو ہونا چاہئے۔ بلکہ ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ ایسے ماہرین بھی اس "اسلامی مہم" میں شریک رہے ہیں جو بنیادی طور پر اس بات کے مخالف ہیں کہ یہاں صحیح کی کوئی مکمل اور صحیح (باقی بر صفحہ ۴۴)

(بقیہ اشارات) صحیح اسلامی تبدیلی نمودار ہو۔

کانفرنس نے کام کا دوسرا حصہ کمیٹیوں کے سپرد کر دیا، اور کمیٹیوں نے افراد میں تقسیم کر دیا۔

نصاب سازی کا معاملہ بھی خوب ہے۔

بھٹو دور میں نصابیات کا جو نیا سلسلہ تیار کیا گیا تھا۔ انہی لکھی لکھائی (بلکہ شاید چھپی چھپائی) کتابوں میں ترامیم کر کے تازہ پالیسی کے قریب لایا جا رہا ہے۔ اس کام میں زیادہ تر منفی اقدام یہ ہے کہ اسلامی عقائد و مقاصد، اور نظریۂ پاکستان کے خلاف کوئی چیز باقی نہ رہے۔ جن نصابیات کا پورا ڈھانچہ کسی اور طرح اٹھایا گیا ہو۔ اب ان کو منفی ترمیمات سے کارآمد بنانا عجیب سی بات ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی اور یہ "نئی" نصابیات اکٹھی آرہی ہیں۔ قدرتی طور پر اثر یہی پڑے گا کہ نئی نصابیات نئی پالیسی کی آئینہ دار ہیں۔ اس طرح نئی تعلیمی پالیسی کے بارے میں حسن ظن کا پیمانہ کمی کی طرف جائے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ عبوری دور کے لئے یہ کام چلانے کی مناسب ترکیب ہے۔ مگر کیا واقعی مناسب ہے؟

ضمناً ایک دلچسپ بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرکزی انقلابی ذہن کی رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے مختلف مضامین اور درجوں کے لئے اتنے مختلف الخیال حضرات نے اپنے اپنے رنگ میں کتابیں لکھی اور لکھوائی ہیں کہ نتائج کار کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیسا انتشار ہے جو آئندہ تعلیم کے لئے نمودار ہو گیا ہے۔

مثلاً ایک صاحب کو موقع ملا تو انہوں نے انیس و دبیر کے چار چھ مرثیے اُردو کورس میں گھسا دیے۔ پھر مرثیوں کے بھی ایسے حصے نصابیات میں دینے کی روایت چلی آرہی تھی جس میں صبح و شام کے مناظر دکھائے جاتے تھے، مگر اب تو ایسے حصے لائے گئے ہیں جن میں داستان کربلا کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس کی تعلیم ساری قوم کے بچوں کو دی جائے گی۔

پھر کسی اور نے مولینا جعفر ندوی کا وہ مضمون داخل نصاب کر دیا ہے جو قل العفو کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے غیر معیاری انداز سے لکھا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ندوی صاحب کی جس تحریر پر اختلافی بحثیں ہوتی رہیں اور متعدد مضامین جواباً لکھے گئے، اسی اختلافی تحریر کو اٹھا کر طلبہ کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ کہ وہ چار و ناچار اسے پڑھیں اور اس کو ترجمانی حقیقت، تفسیر قرآن اور تعبیر تاریخ سمجھیں۔

پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ شیعہ سنی اتحاد کے نام پر ایسی چیزوں سے بچ کے نکلنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جن سے کوئی ایک گروہ اختلاف رکھتا ہو۔ اس اصول کے تحت خلافت راشدہ کا تین چوتھائی دور تاریخ سے حذف کرنا ہوگا۔ (پھر باقی کیا رہے گا) یا صرف ایسی آیات و احادیث پڑھانے کی پابندی جن پر دونوں فریق متفق ہوں، یہ معنی رکھتا ہے کہ شیعہ نقطۂ النظر سے جو چیز درست نہ ہو، وہ خارج کر دی جائے۔ یعنی اقلیت کی مرضی چلے اور اکثریت اپنی اولادوں کو صحیح دینی تصور، صحیح احکام اور محترم شخصیتوں اور ان کے کارناموں سے بے خبر رکھے۔ گویا ترتیب بالکل الٹ گئی کہ نظام تعلیم اکثریت کے عقائد و تصورات کا حامل ہوتا ہے، اور اقلیتوں کو کچھ مراعات دی جاتی ہیں۔

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر اسی تجربے کی بنیاد پر مصر میں یہ بات طے پائے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں (عیسائیوں سے اپنے کسی فرقے کو تشبیہ دینا مطلوب نہیں) کے اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ صرف ایسی چیزیں قانون اور تعلیم میں لائی جائیں جن پر دونوں متفق ہوں۔ اس کے بعد کیا رہے گی اسلامیت! اتحاد کا کیا عجیب فارمولا کسی زرخیز دماغ نے نکالا ہے۔

اُردو زبان کو پوری طرح تعلیمی زبان کی حیثیت دینے کے مطالبے میں یہ بات ازخود شامل تھی کہ اُردو میڈیم اور انگریزی میڈیم اسکولوں (کانونٹ اور پبلک اسکول) کے دو الگ الگ دھارے جس طرح بہ رہے ہیں ان کو ایک کیا جائے۔

نئی تعلیمی پالیسی یہ بھی نہ کرسکی۔

حال ہی میں وزیر تعلیم کا ایک اخباری بیان نظر سے گذرا جس میں تعلیمی پالیسی ہی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ فرمایا کہ گورنمنٹ کے اپنے قائم کردہ انگریزی میڈیم اسکولوں کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ اُردو زبان کو رائج کریں۔ اس حکم سے خوشی کی ایک لہر عام لوگوں میں دوڑ گئی، مگر حقائق کے جاننے والوں کے لیے اس حکم کی زد اتنی محدود تھی کہ کوئی بڑا حقیقی فرق واقع نہیں ہوگا۔ میں قطعی اعداد و شمار تو حوالے کے بغیر نہیں دے سکتا، مگر اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں انگریزی میڈیم اسکولوں کی تعداد ساڑھے سات سو سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں سے گورنمنٹ کے کوئی دس بیس اسکول ہوں گے۔ ان میں اگر اُردو زبان رائج بھی ہو جائے تو ڈھائی صد سے زائد اسکول علی حالہا باقی رہیں گے۔ علاوہ بریں انگریزی میڈیم

اسکولوں کی ایک تعداد ملٹری کی بھی ہے۔ اُن سے بھی ۱۵ سال تک کوئی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔

اب اگر مخلصانہ اور حنیفانہ نقطۂ نظر سے سوچا جائے تو ایک حکم سے تمام کے تمام انگریزی میڈیم اسکولوں کو اُردو کے زیر نگیں لایا جا سکتا تھا۔ اور وحدتِ تعلیم پیدا کی جا سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بیرونی مشنری کانونٹ اسکولوں کے ساتھ بحالاتِ موجودہ برنرمی برتی جا سکتی تھی کہ وہ قائم رہیں مگر کوئی پاکستانی طالب علم ان میں داخلہ نہیں لے سکتا۔

سکولوں کو چھیڑے بغیر ایک طریقہ اور بھی ہے۔ بس اتنا فیصلہ کرنا کافی ہے کہ تمام امتحانات اور انٹرویوز اُردو زبان میں ہوں گے۔[۱]

نئی تعلیمی پالیسی اس اہم معاملے میں ادائے فرض کے صحیح معیار سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

بلکہ اس میں غیر ضروری طور پر پچھلی ایک روایت کی لکھی پڑھی جاری گئی کہ ابتدائی مدارج میں قومی زبان اُردو کے ساتھ ساتھ مقامی علاقائی بولی کو بھی ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے برتا جائے۔ فی الحقیقت اتنی بات کافی تھی کہ اساتذہ مقامی علاقائی بولیوں کو ذریعۂ تفہیم بنا سکتے ہیں، مگر اس معنی میں ذریعۂ تعلیم صرف اُردو زبان ہوگی کہ نصابیات اُردو میں ہوں گی اور امتحانات بھی اُردو زبان میں لیے جائیں گے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ذہنی پراگندگی ضرور نشوونما پائے گی۔

نئی تعلیمی پالیسی نے اپنے روبعمل لانے کے لیے اساتذہ کے پارٹ کی شدید اہمیت کو واضح کرنے کے باوجود ان سے محض اتنا ہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ تعلیم کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ نظریۂ پاکستان سے گہری وابستگی رکھتے ہوں۔ اسلام کا جو ہر روز راگ مقاصد میں چھیڑا گیا تھا، یہاں آکر اس کے سُر بے حد دھیمے ہو گئے ہیں۔ اصل شئی مطلوب اسلامیت تھی، یہاں وہ پاکستانیت تک محدود ہو گئی ہے۔

---

[۱] اردو کو اس کا صحیح مقام دینے کے لئے بعض چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں بہت نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کابینہ کی تمام کارروائیاں اردو میں ہوں گی۔ ایسے افراد کو وقتی طور پر استثنیٰ دیا جا سکتا ہے جو اردو میں تقریر نہ کر سکیں۔ اس طرح ایک مؤثر تبدیلی یہ ہو سکتی ہے تمام محکموں کے سیکرٹری حضرات فائیلوں پر تلخیصی نوٹ اردو میں لکھیں گے۔ مزید قابل توجہ اہم اور مؤثر صورتیں یہ ہیں:

۱۔ پبلک سے تعلق رکھنے والے تمام دفتری فارم اردو زبان میں ہوں گے۔ (خواہ کوئی دوسری زبان بھی ساتھ استعمال کی گئی ہو۔

۲۔ تمام فرموں کی رجسٹریشن کے لئے لازم ہوگا کہ وہ اپنے میمورنڈم اور آرٹیکلز اردو میں داخل کریں۔ نیز اپنے سائن بورڈ لیٹر فارموں اور مہروں وغیرہ میں اردو کو لازماً استعمال کریں۔

۳۔ دفتروں اور دکانوں کے تمام بورڈ لازمی طور پر اردو میں ہوں گے۔ ضرورت ہو تو ساتھ دوسری زبان استعمال کی جا سکتی ہے۔

۴۔ تمام گاڑیوں کی نمبرپلیٹیں اردو میں ہوں گی۔

۵۔ ریلوے، بسوں، ڈاک کی ٹکٹوں، رسیدی ٹکٹوں، نیز کھیل یا تفریح سے متعلق تمام ٹکٹوں پر اردو اندراجات ضروری ہوں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی اسلامی نظامِ تعلیم میں کام کرنے کے لیے ایسے لوگ موزوں ہو سکتے ہیں جو اسلام کا علم نہ رکھتے ہوں یا اسلام پر عمل نہ کرتے ہوں ؟ اگر ایسا سمجھا گیا ہے تو مشرقی پاکستان کے اس دلچسپ تجربے کی یاد تازہ ہوتی ہے کہ بہت سے سرکاری اسکولوں میں اسلامیات کا کورس پڑھانے کے لیے ہندو اساتذہ مامور تھے۔ پھر وہ عبرتناک واقعہ بھی یاد آتا ہے جسے مولانا روم نے بیان کیا ہے کہ ایک بستی والوں نے ایک یہودی کو معاوضے پر اذان دینے کی خدمت سونپ رکھی تھی۔

اگر اسلامی نظامِ تعلیم محض ایک سلوگن نہیں ہے بلکہ اُسے قطعی طور پر روبکار لانا ہے اور اب اسلامیات محض ایک مضمون ہی نہ رہے گا بلکہ تمام مضامین کی رگ رگ میں دین کے مرکزی اور بنیادی علم کو سرایت کرنا ہے تو پھر کسی بھی مضمون کو پڑھانے کے لیے اسلامی ذہن و کردار کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اساتذہ کی ٹریننگ کے باب میں کوئی نقشہ نہیں بنایا گیا۔

ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ موجودہ اساتذہ جو کئی سال تک کام کرتے رہیں گے، ان میں کمیونسٹ ملحد، مذہب دشمن، مغرب پرست، سیکولرازم کے قائل، قادیانی اور کج کردار لوگ بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہ ساری تعلیمی فوج مل کر اسلام کے لیے کیا فتوحات کر سکے گی۔

اسلامی نظامِ تعلیم کو جس دن سے شروع کرنا ہو، اس دن سے اعلان کر دیجیے کہ اب ہماری درسگاہوں کو صرف مسلم ذہن و کردار کے لوگوں کی ضرورت ہو گی، بقیہ حضرات ابھی سے اپنے مستقبل کی راہ ڈھونڈ لیں۔

لیکن نئی تعلیمی پالیسی ایسے کسی اقدام کے آثار اپنے اندر نہیں رکھتی ہے۔

یہاں میں ایک اور مسئلے کو بھی از سرِ نو چھیڑ رہا ہوں۔

پچھلی پالیسی کے تحت مطبوعہ نصابی کتابوں کو دیکھ کر میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ اردو زبان کو نسخ ٹائپ کے سانچے میں ڈھال کر کوئی بہتر اقدام نہیں کیا گیا ہے۔

قبولیتِ عامہ کے لحاظ سے دیکھیے تو معاشرے میں نستعلیق رسم الخط میں چھپنے والے اخبارات اور کتابوں ہی کا چلن ہے۔ اکا دکا رسالہ یا کتاب اگر نسخ میں چھپے بھی تو اس سے اجتماعی ذوق کی نوعیت نہیں بدلتی۔ نسخ رسم الخط جن فوائد کے لیے اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی غیر حقیقی مفروضات ہیں۔

مثلاً وقت کی بچت اور سرعتِ طباعت کا ایک پہلو مستقبل کے لئے سامنے رکھا گیا مجھے پریس کا جو تجربہ ہے اس کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جو انتظامات اب تک ہمارے ہاں ہیں، ان کے لحاظ سے ٹائپ، بلاک اور آفسٹ طباعت کا معاملہ تقریباً یکساں ہے۔ بلکہ ونڈاٹیک اور آفسٹ طباعت کے سسٹم نے نقشہ ہی بدل دیا ہے ٹائپ جگہ زیادہ لینے کی وجہ سے مطبوعات کے مصارف کو بڑھا دیتا ہے۔

ان حالات میں ذوقِ عام کو جس کا معیار بہت اچھا ہے، اور نستعلیق رسم الخط میں ماہرینِ خطاطی کی کئی نسلوں نے جو حسن پیدا کیا ہے، اسے گویا ہم جبری طور پہ تباہ کریں گے۔

کچھ اور پہلو بھی گفتگو کے ہیں، مگر یہاں ان سے تعرض کرنا مناسب نہیں مختصراً میری گذارش یہ ہے کہ جدید ترین تعلیمی پالیسی میں یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ نصابیات خوبصورت نستعلیق خط میں چھپیں گی۔

رہا چٹھیاں ٹائپ کرنے کی مشینوں کا مسئلہ، سو آپ اسے نسخ میں بھی رکھ سکتے ہیں اور نستعلیق میں کام ہو سکتا ہے۔

میں آخر میں یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ سارے معاملے کو از سرِ نو سوچا جائے اور انتخابات سے پہلے پہلے تعلیمی پالیسی کی اصلاح بھی ہو جانی چاہیے۔ نئی پالیسی کے تحت لکھے جانے والے نصابیات سے قبل کے عبوری دور کے لئے فوری طور پہ بھٹو دور کی لکھوائی ہوئی نصابیات کو بہتر بنا کر اُس کے ساتھ مختصر اضافی کورسز شامل کئے جائیں۔

لیکن تعلیمی گاڑی کو صحیح پٹڑی پر ڈالنے کے لئے ایسے انقلاب پسند ذہنوں کو تلاش کیا جائے جو برسوں سے اسلامی تعلیمی انقلاب کے مسئلے پر سوچتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سربراہی میں ماہرین کی ٹیمیں کام کریں گی تو چُول سے چُول درست بیٹھے گی۔ ورنہ معاشرہ پھر ایک نئی تعلیمی پالیسی کے انتظار میں بے چین رہے گا۔

خدا کرے کہ میری یہ مخلصانہ گذارشات صحیح سطح تک پہنچیں، مناسب شخصیتوں کی توجہ حاصل کریں اور ان کے جوہرِ مدعا کو قبول کر کے رہی سہی کسر جلد پوری کر لی جائے۔

ماہنامہ ترجمان القرآن کے متعلق خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے